اسلامی تہذیب کو درپیش مشکلات کا انسانی حل

سیّد سردار علی ○

ظہورِ اسلام کے ایک ہزار سال بعد تک مسلمان، قرآن کے اخلاقی احکامات کے تناظر ہی میں اپنی تاریخ کی تعبیر اور تجزیہ کرتے آئے ہیں۔ مسلمانانِ عرب نے اسلام کے اخلاقی تصورِ حیات کو، افریقا اور دجلہ و فرات کے علاقوں میں پچھلے چار ہزار سالوں کے دوران پروان چڑھنے والے رائج الوقت معاشرتی نظام اور پیداواری نظام سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ امتزاج کا یہ کام اُموی دور میں شروع ہوا، عباسی خلافت میں فکری طور پہ بارآور ہونے لگا، اور عثمانی خلافت میں اس کو شان و شوکت اور غلبہ حاصل ہوا۔

جدیدیت کی 'پیراڈائم شفٹ' (Paradigm Shift) کے بعد حالات کا تقاضا تھا کہ مسلمان یہ ادراک کر لیتے کہ کوئی سا بھی اخلاقی نظام ہو، انسان اپنے اظہار کے لیے بہرحال اسی مادی دنیا کے اسباب اور وسائل کا محتاج ہوتا ہے۔ لیکن افسوس کہ مسلم شعور آج تک تاریخ کو اس تناظر میں دیکھنے کی صلاحیت ہی پیدا نہیں کر سکا، اور اگر کیا بھی تو جزوی اور محدود حد تک۔ اس لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ ان کی وہ تمام کوششیں، جو مسلم دنیا اور مسیحی مغرب کے درمیان فوجی طاقت، مادی دولت، اور ثقافتی اثر و رسوخ کے مسلسل بڑھتے ہوئے فرق کی تشخیص کے لیے تھیں، سودمند ثابت ہوتیں۔ کیونکہ یہ تشخیص انسانی معاشروں کے عروج و زوال کے معروضی اور آفاقی پیمانوں کے بجائے صرف عقائد کے زیرِاثر، جزوی، یا سطحی مفروضوں پر مبنی تھی۔ نتیجتاً، صورتِ حال کو بہتر بنانے کے لیے یہ کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ اسی لیے اس بات سے اب ہمیں حیران نہیں ہونا چاہیے کہ

○ مشیر، عالمی کاروباری مالیات و انجینئرنگ، اور محقق۔ انگریزی سے ترجمہ: فہیم بلال

قوت اور وسائل میں یہ تفاوت، صرف مسلم معاشروں اور مغرب کے درمیان ہی نہیں ہے، بلکہ اب تو مسلم معاشروں اور کئی دیگر غیر مغربی معاشروں کے درمیان بھی یہ فرق بڑھتا جا رہا ہے۔

دُنیا بھر کے مسلمانوں کو یہ سمجھنا چاہیے کہ صرف دینِ اسلام کی راہ سے بھٹکنا ان کی اس کمزوری کا سبب نہیں ہے۔ ہمارے دور میں مختلف تہذیبوں کے درمیان طاقت کے اس عدمِ توازن کے ادارک کے لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے اس بات کو شعوری طور پر سمجھ لیں کہ ایک 'جدید صنعتی معاشرہ' ماضی کے پیداواری نظاموں اور سماجی بندوبست سے بنیادی ہیئت ہی میں مختلف ہے۔ جب تک مسلمان تجزیے اور اصلاحِ احوال کی کوششوں کو ان مبادیاتی (Fundamental) غلطیوں سے پاک نہیں کریں گے، اُس وقت تک، اپنی عظمتِ رفتہ کی بازیافت کے لیے مسلمانوں کی سب کوششیں ماضی کی طرح لاحاصل ہی رہیں گی۔

قبولِ اسلام کے بعد مسلمانانِ عرب چند ہی عشروں میں اپنے آبائی صحرائی مسکن جزیرہ نمائے عرب کے گرد پھیلے زرخیز ہلال نما (Fertile Crescent) خطے پر قابض ہو گئے۔ عراق، شام، مغربی ایران اور مصر پر مشتمل یہ علاقہ اپنی جغرافیائی ہیئت، اور ہزاروں برس سے باقاعدہ کاشتکاری کا اولین مرکز ہونے کے ناتے، اس نام سے پہچانا جاتا تھا۔ پھر صرف ایک صدی میں وہ دریائے سندھ سے لے کر اسپین کے ساحل تک پہنچ چکے تھے۔ مگر اس دنیا میں ایسی سلطنت قائم کرنے والے وہ نہ پہلے فاتح تھے اور نہ آخری۔ ان سے پہلے سائرسِ اعظم (م:۳۲۳ ق م)، سکندرِاعظم (م:۵۳۰ ق م) اور رومی فاتحین اور پھر منگول، مغربی یورپی اور روسی فاتحین فتوحات کرتے آئے۔

بلاشبہہ اسلام نے ہی عربوں کو وہ ولولہ، اتحاد اور اشاعتِ دین کا جذبہ دیا، جو اس کارِعظیم کا محرک بنا۔ فتوحات کے لیے انھیں وہی جنگی حربے اور نظم ونسق کے طریقے استعمال کرنے پڑے، جو اس زمانے کے دیگر تمام معاشروں میں رائج تھے۔ عرب جن ہتھیاروں اور جنگی چالوں کا استعمال کرتے تھے، وہی ان کے دشمن بھی کرتے تھے۔ جب وہ وسیع وعریض علاقوں پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے، تو انھیں ریاست کے نظم ونسق کو چلانے کے لیے انھی انتظامی ڈھانچوں کا سہارا لینا پڑا، جو پرانی میسوپوٹیمین (بین النہرین) اور مصری سلطنتوں نے بنائے تھے۔ ان کے شوقِ شہادت اور

جذبۂ ایمانی کی میدانِ جنگ میں اہمیت اپنی جگہ، مگر میدانِ جنگ میں فتح وشکست کا فیصلہ صرف جذبے کی بنیاد پر نہیں ہوتا۔ اسلامی فوج ہر بار ہر جنگ میں فتح یاب نہیں ہوسکی۔ اُموی خلافت کے قسطنطنیہ پر تمام حملے ناکام رہے۔ فاطمی حکمران، یروشلم شہر کو صلیبیوں کے قبضے میں جانے سے نہ بچا سکے، اور بنوعباس کا دارالخلافہ بغداد ہلاکو خان (م: ۱۲۶۵ء) کے لشکر نے ۱۲۵۸ء میں تاراج کر دیا۔ فتح وشکست جن مادی اسباب پر منحصر ہوتی تھی وہ کافر، عیسائی یا مسلمان فوج سبھی کی دسترس میں ہوا کرتے تھے۔

عرب اور مسلمانوں نے جو بھی مادی ترقی اپنی سلطنت کے قیام کے بعد حاصل کی، وہ صرف دین پر عمل کرنے کا ہی انعام نہیں تھی، بلکہ اس میں ان کی فکری، علمی، اخلاقی اور ہمہ جہت عملی جدوجہد بھی شامل تھی۔ عباسی خلافت کے سنہری عہد میں اسلامی تہذیب اپنے دور کی دوسری تہذیبوں سے دنیاوی خوش حالی کے حوالے سے کوئی بہت زیادہ بہتر نہیں تھی۔ ایک ہزار سال پہلے، دنیا میں تین بڑے تہذیبی مراکز تھے: اس دور کا خوش حال ترین معاشرہ چین کا تھا۔ سونگ خاندان کی چینی سلطنت میں ۱۰ کروڑ سے زیادہ لوگ باقی تہذیبوں سے کہیں بڑھ کے ایک ترقی یافتہ تمدن میں زندگی گزار رہے تھے۔ سلطنتِ روم کی شان وشوکت کی وارث بازنطینی سلطنت کا دارالحکومت قسطنطنیہ، دنیا کا امیر ترین شہر تھا۔ اسی دور کی تیسری بڑی طاقت عباسی خلافت کے مسلمان شہریوں کی خوش حالی اور معیارِ زندگی ان دو ہم عصر تہذیبوں کے شہریوں سے مماثلت رکھتے تھے۔ عرب اور مسلمانوں کی فتوحات کے نتیجے میں ہمسایہ ریاستوں کے زرخیز علاقے زیرِ قبضہ آ گئے اور فاضل زرعی پیداوار اب دمشق اور بغداد آنے لگی۔ جس کے نتیجے میں انھیں مادی ترقی اور خوش حالی دیکھنے کا موقع ملا۔ مسلمان زراعت کے طریقوں میں کچھ جدت بھی لائے، مگر دولت کی تخلیق کے کسی نئے نظام کو جنم نہیں دے سکے۔ اس دور کی مسلم خلافت سمیت تمام معاشروں میں زیادہ تر آبادی بمشکل ہی گزر بسر کر پاتی تھی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ساڑھے پانچ ہزار سال پہلے انسانی تہذیب کے آغاز سے انسان کی فی کس آمدنی آج کے حساب سے دو سے تین ڈالر یومیہ تک ہی محدود چلی آ رہی تھی۔ اس معمولی گزر بسر کے قابل فی کس آمدنی میں بڑھوتری کے آثار اٹھارھویں صدی کے وسط میں صنعتی انقلاب کے نتیجے میں آنا شروع ہوئے۔ ورنہ چین ہو یا ہندستان، مشرقِ وسطیٰ ہو یا یورپ، انسانی تاریخ کی

ان سبھی عظیم تہذیبوں میں کم و بیش ایک ہی طرح کا معیارِ زندگی اور معاشی حالات تھے۔ مسلم دنیا کے حالات بھی ان سے چنداں مختلف نہیں تھے۔

بعثتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے آغاز سے ایک ہزار سال بعد تک مسلمانوں کی فتوحات، مال و دولت اور طاقت کے مذہبی اسباب کے باوجود یہ سب انھی دنیاوی آلات و ذرائع کے سہارے ممکن ہوا، جو اس دور میں مروج تھے اور دنیا کے تمام دوسرے معاشروں کو بھی یکساں میسر تھے۔ اپنی سلطنت کے قیام اور استحکام کے دوران دنیا میں دستیاب ان مادی ذرائع سے فائدہ اٹھانے میں مسلمان اکثر اوقات بہت کامیاب رہے، لیکن کبھی انھیں زیادہ کامیابی نہ مل پائی۔ اس دنیا میں اسلامی تہذیب کا عروج اپنے مخصوص اخلاقی جوہر کے باوجود زمان و مکاں میں کارفرما علت و معلول کے ان آفاقی اصولوں کے باعث ممکن ہوا، جو باقی تمام معاشروں پر بھی اسی طرح لاگو ہوتے تھے۔ چوں کہ عربوں کی اسلام قبول کر لینے کے بعد سے فتوحات اور خوش حالی کے ایک طویل دور کا آغاز ہوا تھا، اس لیے فطری طور پر مسلمانوں کے نزدیک ان کو ملنے والی طاقت، عظمت اور مادی خوش حالی اسلام کی فیوض و برکات کا لازمی نتیجہ تھیں۔ سماجی عوامل اور نتائج کے لیے مادی اسباب و علل کے بجائے اخلاقی توجیہات تلاش کرنے کا یہ اندازِ فکر آج تک مسلمانوں میں مقبول ہے۔ اس مخصوص تاریخی تجربے کے نتیجے میں مسلمان جس تجزیاتی طریقۂ کار کو آفاقی سمجھے بیٹھے تھے، وہ غیر اسلامی تہذیبوں کے عروج و زوال کے درست تجزیے میں یکسر ناکام ثابت ہوا۔ یہ اندازِ فکر آج تک جدید صنعتی مغربی تہذیب کے عروج اور اس کے نتیجے میں عالمِ اسلام کے زوال کی درست تشخیص کرنے میں مکمل طور پہ غیر متعلق ثابت ہوا ہے۔

اسلامی تہذیب سمیت دورِ جدید سے پہلے کی تمام تہذیبوں کا استحکام ایک مخصوص سماجی نظام اور تخلیقِ دولت کے روایتی نظام پر منحصر ہوا کرتا تھا۔ لیکن یورپی نشاتِ ثانیہ کے ساتھ ہی مغربی یورپ کے ممالک میں یہ دونوں نظام ایک جوہری تبدیلی سے گزرنے لگے۔ یونان اور روم کے قدیم علوم، فلسفہ و منطق کی تکنیکی مہارت اور انسانی عظمت و عزم سے بھرپور فلسفۂ زندگی کو اپنا لینے کے بعد یورپی فلسفیوں نے ان کلاسیکل علوم میں اضافے بھی کیے۔ کائنات کے ہیلیوسینٹرک ماڈل کو تسلیم کر لینے سے انسان اور زمین کی مرکزیت کا عقیدہ متزلزل ہو گیا۔ استقرائی استدلال، تجرباتی سوچ اور

علمِ ریاضی کے ملاپ نے جدید سائنس اور آئزک نیوٹن (م: ۱۷۲۷ء) کے قوانین کو جنم دیا۔ کرۂ ارض کے گرد بحری مہمات اور امریکی براعظموں کی دریافت نے انسان کے ذہنی اُفق کو وسیع تر کر دیا۔

انسان کی یہ دریافتیں اور پیش قدمیاں کئی ایجادات، انسانی زندگی میں بہتری کے ساتھ سماجی، معاشی اور سیاسی اداروں میں جدتیں لے کر آئیں۔ پرنٹنگ پریس کی آمد نے وسیع پیمانے پر اشاعتِ علم کو آسان کر دیا۔ کولمبین ایکسچینج اور دوسرے زرعی انقلاب نے یورپی باشندوں کی غذا کو پہلے سے بہت بہتر بنا دیا۔ 'تحریک اصلاح' (Reformation) کے بعد، چرچ کی سیاسی اجارہ داری کے خاتمے سے جدید قومی ریاستوں کے نظام کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ یورپ میں ہونے والی مذہبی جنگوں بالخصوص ۳۰ سالہ جنگ کے نتیجے میں ان کے فنِ حرب وضرب میں بہت بہتری آئی۔ اور بالآخر ۱۹ویں صدی میں صنعتی انقلاب نے صنعتی پیداوار اور خدمات کی فراہمی کے ذریعے مغرب اور باقی دنیا میں ایک ایسی تفریق پیدا کر دی، جو روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔

مغرب کا عروج، صرف مسلم دنیا کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام غیر مغربی تہذیبوں کے لیے بھی تباہ کن ثابت ہوا۔ برصغیر ہند میں برطانوی نوآبادی کے قیام سے نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو اور سکھ اقوام کو بھی ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹ویں صدی کے دوران، امریکیوں نے جاپان میں تقریباً ۷۰۰ سال سے قائم شوگن نظام کو ختم کر دیا اور اس ملک کو باقی دنیا کے ساتھ رابطے پر مجبور کر دیا۔ ۱۹۱۱ء میں، پہلی جنگ عظیم سے ذرا پہلے، چین کے انقلابیوں نے دو ہزار سال پرانے بادشاہت کے نظام کو ختم کر دیا، اور پہلی جنگ عظیم نے روسی اور عثمانی سلطنتوں کا بھی خاتمہ کر دیا۔ پرانی کولمبیائی تہذیبوں اور سب صحارن افریقا کی آبادیوں کا حال تو اور بھی برا ہوا۔ صرف پانچ سو سال پہلے تک، مغربی یورپ کی کوئی قوم اپنی سرزمین کے علاوہ کسی اور جگہ موجود نہیں تھی۔ لیکن ۱۹۱۳ء میں اس دنیا کا ۸۴ فی صد رقبہ یورپی طاقتوں کے قبضے میں تھا۔ تہذیبوں کی کش مکش میں بازی کا ایسے پلٹ جانا انسانی تاریخ کا ایک ناقابلِ یقین واقعہ تھا۔

مسلم تہذیب کے برعکس بہت سی غیر مغربی تہذیبوں نے مغرب کی بے پناہ قوت کو دیکھتے ہوئے جلد ہی یہ بھانپ لیا تھا کہ اب ان کا وجود خطرے میں ہے، اور دنیاوی طاقت کے ہر ایک پیمانے پر مغرب کے ہم پلہ بن کر ہی اپنی اقدار کا تحفظ کیا جا سکتا ہے۔ ان اقوام نے اپنے عقیدے،

اقدار، اور روایات کے ضروری خواص اور مغربی تسلط کی بنیاد یعنی صنعتی پیداواری نظام کے امتزاج کے لیے بھرپور کوششیں شروع کر دیں۔ یہ کوششیں رنگ لائیں اور وہ مکمل بربادی سے بچ گئے۔ حالانکہ ان تمام غیر مغربی تہذیبوں کے مقابلے میں یہ مسلمان ہی تھے، جو نہ صرف مغرب کا فلسفہ، ثقافت اور مذہب کو زیادہ اچھی طرح سے سمجھتے تھے بلکہ ایک طویل عرصے سے اس کے ساتھ برسرِ پیکار بھی تھے۔اسی لیے توقع کی جاسکتی تھی کہ مغرب کے مقابلے میں طاقت کے اس غیر معمولی فرق کو وہ جلد ہی دُور کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔مگر سوال یہ ہے کہ آخر کیا وجہ بنی کہ تین سو سال سے جاری کوششوں کے باوجود مسلمان اپنے اور مغرب کے مابین طاقت اور وسائل کے اس غیر معمولی تفاوت کو ختم نہیں کر سکے؟

ایک تو مسلمان ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکے کہ ان کے موجودہ بحران کی وجوہ داخلی نہیں۔ پچھلے پانچ سو سال کے دوران، دنیا کا کوئی بھی سیاسی نظام، مغرب کی یلغار کے سامنے نہیں ٹھیر سکا۔ ۱۸ویں صدی کے اواخر سے کوئی بھی معاشرہ معاشی پیداوار کے میدان میں مغرب کا مقابلہ نہیں کرسکا۔ بلاتفریق سبھی غیر مغربی اقوام ،مغرب کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہوئیں۔ پھر بھی مسلمان یہ سمجھ نہیں پا رہے کہ وہ اپنی کسی کوتاہی یا کمزوری کی وجہ سے پیچھے نہیں رہ گئے بلکہ مغرب اپنی غیر معمولی ترقی اور 'پیراڈائم شفٹ' کی وجہ سے دوسری تمام تہذیبوں سے آگے نکل گیا۔ ہم مسلمان اپنے 'زوال' کے اسباب کو اپنے ہی ماضی میں ڈھونڈتے ہیں۔ وہ آج بھی اپنی تاریخ کے اس لمحے کی کھوج میں ہیں جب وہ صراطِ مستقیم سے بھٹک گئے تھے، اور یہ ماننے کو تیار ہی نہیں کہ انسانی تاریخ کو اس تناظر میں دیکھنے کا مخصوص ومحدود نقطۂ نظر آفاقی اور معروضی نتائج نہیں دے سکتا۔

اپنی تہذیب کے عروج کے دوران مسلمان اپنے دین کے مِن جانب اللہ ہونے اور اسی کی طرف سے دنیا پر اس کے غلبے کو مقدر کر دینے پر بجا طور پر نازاں تھے اور ماضی کے ان خوش گوار لمحوں کو درست طور پر یاد کرتے ہیں۔لیکن پھر انھوں نے اس خدائی منصوبے کی تکمیل میں کام آنے والے وسائل اور انسانی کاوش کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ اس لیے ان کی طرف سے تاریخ کو دیکھنے کا ایک زاویۂ نظر متعین کر لینا عین فطری تھا۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی طاقت اور آن بان، ماضی میں ان کے خالص ایمان اور اچھے اعمال کی وجہ سے تھی، اسی لیے اب ایمان میں کمی اور

اخلاقی گراوٹ ہی ان کی شان وشوکت چھن جانے کی وجہ ہے۔ اس تجزیاتی فریم ورک کے غیر مؤثر ثابت ہوئے تین صدی سے زائد عرصہ گزر چکا ہے، مگر اس کے باوجود، مسلم ذہن اب تک اس نظریے کی جگہ علت ومعلول کے فطری اور آفاقی قوانین کی روشنی میں اپنے مسائل کا تجزیہ کرنے پہ آمادہ نہیں ہوسکا۔

جب مسلمان، مغرب سے کچھ سیکھنے پر مجبور ہو بھی جائیں تو وہ مغرب کے فکری پیمانوں کو اپنا نہیں سکتے یا پھر ان کے سطحی استعمال سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اسی لیے وہ جو بھی تجزیہ کرتے ہیں وہ تاریخی اور منطقی طور پر غلط ہوتا ہے۔ مسلمان غیر ارادی طور پر اخلاقی نظریۂ تاریخ کی روشنی میں ہی مغرب کے عروج کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ مغرب کی تاریخ میں وہی اخلاقی قوت کارفرما دیکھتے ہیں، جو کبھی خود ان کی اپنی کامیابی کا باعث تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ مغرب میں یہ اُبھار، اخلاقی تعلیمات اور اقدار کسی بھی مابعد الطبیعیاتی نظام کا نتیجہ نہیں۔ ان کے نزدیک مغرب سیکولر ہوتے ہوئے بھی اس لیے کامیاب ہے کیونکہ وہ مسلمانوں کے دین اور ایمان سے کشید کی گئی آفاقی اقدار کا حامل ہے۔ مغرب کے عروج کی یہ سطحی سی وضاحت ہے، جو ان کے اپنے اندازِ فکر کے تضاد کی تصدیق کرتی ہے۔ جس سے معاملات کے درست ادراک کے لیے تاریخ کے کسی بھی معروضی اور تنقیدی تجزیے کی راہیں بھی مسدود ہوجاتی ہیں۔

مغربی طاقتوں کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے والی مسلم اقوام جب اپنے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر نہ کرسکیں تو پھر مغربی استعماریت (Colonisation) کے دور اور جبر کو ہی اپنی موجودہ ناکامیوں کا ذمہ دار ٹھیراتی ہیں کہ اسی استعماریت اور نوآبادیاتی نظام نے ان کی شان وشوکت کو برباد کیا تھا اور یہ انھی جیسی یورپی نوآبادیاتی کالونیوں سے لوٹی ہوئی دولت تھی، جس کے سہارے یورپ میں صنعتی انقلاب آیا۔ جب آج کے جدید دور کو ماضی پر قیاس کرنے کی غلطی کی جائے گی تو اسی قسم کے تجزیے سامنے آئیں گے۔ اگر یہ مسلم اقوام طاقت اور عوامی فلاح وبہبود کے پیمانوں پر مغربی اقوام سے بہتر ہوتیں تو کوئی ایک تو جدیدیت کی اس یلغار کو روکنے میں کامیابی حاصل کرلیتی۔ آخر آزادی کے بعد بھی ان میں سے کوئی ایک قوم بھی اپنی عظمتِ رفتہ کا احیاء کیوں نہ کرسکی؟ اور کیوں کوئی ایک بھی مسلم ملک اپنے نوآبادیاتی دور کے آقا کی طاقت کے ہم پلہ نہیں آسکا؟

دراصل صنعتی دور سے پہلے کی بادشاہتوں کے طرزِ حکمرانی اور جدید دور کی یورپی قومی ریاستوں کے غلبے میں مماثلت قائم کر کے کیا جانے والا تجزیہ نہ تو ماضی میں فاتح اور مفتوح کی دولت اور طاقت کے فرق کی کوئی درست وضاحت کرتا ہے اور نہ نوآبادیاتی دور کے خاتمے کے صدیوں بعد بھی اس فرق میں مسلسل اضافے کی کوئی قابلِ قبول وضاحت پیش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسو سال سے مغرب کے عروج کو سمجھنے کے لیے کی جانے والی کوششیں ابھی تک یہ گرہ نہیں کھول سکیں کہ جدیدیت دراصل ماضی اور حال کے درمیان ایک واضح تقسیم، ایک 'کوانٹم لیپ' اور انسان کو دستیاب مادی اسباب میں ایک 'پیراڈائم شفٹ' کا نام ہے۔

جب بھی مسلمان محققین یورپ کے عروج کا معروضی تجزیہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کی فکری کم مائیگی ان کے آڑے آتی ہے۔ وہ یورپی تاریخ میں عہدِ وسطیٰ کے بعد پیش آنے والے واقعات کے تسلسل میں سے ترقی کے ایسے تصورات ونظریات اخذ نہیں کر پاتے، جو آفاقی اور وقت کی قید سے آزاد ہوں۔ وہ کچھ مخصوص تاریخی واقعات میں ہی اُلجھے رہتے ہیں، یا پھر علامات اور نتائج کو ہی اصل مسئلہ سمجھنے کی غلطی کر بیٹھتے ہیں اور یوں ان کا تجزیہ منطقی مغالطے کا شکار ہوجاتا ہے۔

کچھ مسلمان مؤرخین [1] نے غیرالہامی فلسفۂ تاریخ پر کام کا آغاز تو ضرور کیا، لیکن مسلم معاشرے بحیثیتِ مجموعی ایسے علمی پیمانے تشکیل نہیں دے سکے، جو اس عالمِ اسباب میں پیش آنے والے تاریخی واقعات کی عقلی توجیہہ کرنے کی ضرورت کو پورا کر پاتے۔ مسلم فلسفیوں نے واقعات یا شخصیات کے مشاہدے سے کوئی ایسا عقلی استدلال تشکیل نہیں دیا، جو ہر مابعدالطبیعیاتی نظام کے لیے معیار اور حوالہ بن سکے اور نہ مسلمانوں کا علمی ذخیرہ اتنا وسیع کیا جاسکا کہ وہ یورپی تاریخ کے ہر سیاسی، سماجی اور معاشی واقعے کا درست تناظر سمجھ کر اس کی نوعیت اور اہمیت پر کوئی آفاقی تجزیہ دے سکتا۔ اس طرح مسلمان کوئی ایسا متبادل نظامِ فکر اپنے معاشروں میں پیش نہ کر سکے، جو جدید مغرب کو اسی کے فکری پیمانوں، اسی کی علمی روایات اور اس کے فلسفیانہ سرچشموں کے تناظر میں سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

---

[1] ان میں ابن خلدون (۱۳۳۲ء-۱۴۰۶ء) سب سے نمایاں ہیں۔ کچھ اور اہم نام سلطنت عثمانیہ کے ابراہیم متفرقہ (۱۶۷۴ء-۱۷۴۷ء) اور مغلیہ ہند کے ابوالفضل (۱۵۵۱ء-۱۶۰۲ء) ہیں۔

مسلم شعور نہ صرف مغرب کی کامیابیوں کی فلسفیانہ بنیادوں کا کھوج لگانے میں کامیاب نہیں رہا ہے، بلکہ وہ یورپ کے سائنسی اور سماجی تجربات کے نتائج اور ثمرات سے استفادے کا بھی کوئی داخلی پیمانہ متعین نہ کر سکا۔ کم وبیش تین سو سال سے جدید جنگی ساز وسامان، صنعتی مشینری، قانونی اور آئینی فریم ورک، جدید انتظامی سسٹم اور سماجی اور معاشی اداروں سے استفادے کے باوجود مسلمان ایک ایسا نظامِ فکر تشکیل دینے میں ناکام رہے ہیں، جس میں وہ اپنے ناقابلِ تغیر اخلاقی تصورات اور ان تصورات کے حصول یا تنفیذ کے لیے درکار ہر دم تغیر پذیر ذرائع میں واضح تفریق کر سکیں۔

مسلمان جدید ٹکنالوجی، جدید تصورات اور جدید اداروں سے استفادہ کرتے ہوئے ایک نفسیاتی تذبذب کا شکار بھی رہتے ہیں۔ وہ یہی سمجھتے ہیں کہ قُرونِ اولیٰ میں خاص روحانی مداخلت کے باعث مسلم تہذیب اور ریاست کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ مسلمانوں کے اندر ایسے نظریات نہیں پنپ سکے جو انھیں اطمینان دلاتے کہ سائنس، عقل اور سماجی ارتقاء سے حاصل کیے گئے ذرائع کا استعمال قطعاً غیر اسلامی عمل نہیں ہے، اور یہ بھی کہ ایمان ان سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ جدید سے جدید تر علم اور ذرائع کے استعمال سے انسانی تاریخ میں اپنا کردار ادا کریں۔ ایسے علم الکلام کے نہ ہونے کی وجہ سے جدید ٹکنالوجی، جدید تصورات اور جدید ادارے جب کبھی مسلم معاشروں میں راہ پاتے ہیں تو ان کو بے دلی سے اپنایا جاتا ہے، جس سے کسی بہتری کا امکان نہیں پیدا ہوتا۔

مسلم شعور کے مطابق تاریخ کا آغاز ہی اس وقت ہوا، جب پیغمبرؐ اسلام کی دعوت پر انھوں نے کفر اور شرک چھوڑ کے اسلام قبول کیا۔ اس تاریخ کا نقطۂ عروج انسان کی اُخروی نجات ہے۔ علت ومعلول کی پابند یہ مادی دنیا ہماری تاریخ کو ایک ضروری پس منظر فراہم کرتی ہے، مگر اس کی اہمیت اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ جب تک دنیا کے تمام معاشروں میں مادی حالات ایک جیسے تھے، تو یہ مسلم سوچ عالمی تاریخ کا ایک سادہ اور عملی نوعیت کا تجزیہ کرنے کے لیے کافی تھی۔ لیکن انسانی تہذیب میں آنے والی 'پیراڈائم شفٹ' کے بعد تجزیے کے اس طریق کار کی کمزوریاں واضح ہونے لگیں۔ دوسری طرف اپنی ناکامیوں اور شکستوں کی وجوہ سے آنکھیں بند کر کے، مسلمان صدیوں بعد بھی پھر اسی اندازِ فکر کو اپناتے ہوئے، احیاء کی اسی حکمت عملی پر اعتماد کرتے ہیں جو پہلے بھی انھیں کامیابی سے دوچار نہیں کرتی رہی ہے۔

یورپ کی طاقت کا درست ادراک نہ ہونے کے جو اثرات ہندستان میں مسلم احیاء کی کوششوں پر پڑے، ان کا ذکر کرتے ہوئے مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں: ''حیرت تو یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب کے زمانے میں انگریز بنگال پر چھا گئے تھے اور الٰہ آباد تک ان کا اقتدار پہنچ چکا تھا، مگر انھوں نے اس نئی ابھرنے والی طاقت کا کوئی نوٹس نہ لیا''۔[1] مولانا مودودی ان حضرات کی شہادت کے ایک صدی بعد تجزیہ کرتے ہوئے درست نشاندہی کرتے ہیں کہ ''سیّد احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید نے بھی سارے انتظامات کیے، مگر اتنا نہ کیا کہ اہلِ نظر علما کا ایک وفد یورپ بھیجتے اور یہ تحقیق کراتے کہ یہ قوم جو طوفان کی طرح چھاتی چلی جارہی ہے اور نئے آلات، نئے وسائل، نئے طریقوں اور نئے علوم وفنون سے کام لے رہی ہے، اس کی اتنی قوت اور اتنی ترقی کا کیا راز ہے؟ اس کے گھر میں کس نوعیت کے ادارات قائم ہیں، اس کے علوم کس قسم کے ہیں؟''[2]

اسلام، انسانیت کو اخلاقی زندگی کے مثالی اصول پیش کرتا ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت معاشرے کے سیاسی، معاشی اور سماجی بندوبست کو اس وقت کے جدید ترین پیمانے اور ادارے استعمال کرتے ہوئے اسلامی 'اخلاقی پیراڈائم' (Moral Paradigm) میں نافذ کیا گیا۔ ان اداروں کی ترقی میں بلاشبہہ بازنطینیوں، ساسانیوں اور مصریوں کے علاوہ بھی کئی اقوام کا کردار رہا تھا۔ اسلامی تہذیب ایمان کی روح سے سرشار تو تھی، لیکن اس کی تعمیر و ترقی میں اس زمانے کے مادی اسباب اور انسانی محنت ہی بروئے کار آئے۔ ۱۴۰۰ سال بعد آج اس سلطنتِ ایمان کو خطرات کی جو صورت حال درپیش ہے، اس سے بچاؤ کے لیے عقل اور انسانی کاوش ہی کی مدد درکار ہوگی۔ مولانا مودودی بھی اسی نتیجے پر پہنچے تھے۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحابِ نبیؐ کا صحیح اتباع یہ ہے کہ ''تمدن اور اور قوانینِ طبعی کے اکتشافات سے اب جو وسائل پیدا ہوئے ہیں، ان کو ہم اسی طرح تہذیبِ اسلامی کا خادم بنانے کی کوشش کریں، جس طرح صدرِ اوّل میں کی گئی تھی۔ (تنقیحات)

---

[1] تجدید واحیائے دین، ص ۹۵

[2] ایضاً، ص ۹۵